حضرۃ شیخ الہند رحمہ اللہ کا احسانی وعرفانی مقام

(حصہ دوم)

جناب محمد ظفر اقبال

شیخ الہندؒ: بے نفسی اور عاجزی کا عظیم مظہر:

عجب اور تکبر کے بالمقابل بے نفسی وتواضع ہے۔اس کی حقیقت زبانی اظہار سے زیادہ عملی ہے۔یہ خود کو محض ہیچ مداں، احقر، خاکسار اور فقیر کہہ دینے سے عبارت نہیں بلکہ اس کی حقیقت خود کو کسی بھی امتیازی وصف کی بنا پر عام لوگوں سے بلند سمجھے جانے کی عملی نفی ہے۔ بلکہ عارفین نے تو یہ بات نہایت وضاحت سے فرمائی ہے کہ جس نے اپنے لیے تواضع کو ثابت کیا وہ بے شبہہ متکبر ہے، کیوں کہ تواضع کا دعویٰ تو اپنی رفعت قدر کے مشاہدے کے بعد ہوگا، پھر جب اپنے لیے تواضع کا دعویٰ کیا گیا تو گویا اپنے مرتبے کی بلندی کا مشاہدہ کیا، یہی تکبر ہے۔ بے نفس، متواضع اور عجب سے پاک شخص ہمیشہ عام انسانوں میں گھلا ملا رہتا ہے۔اس کے انداز واطوار حاکمانہ نہیں ہوتے اور نہ وہ خوردوں سے کسی بڑائی یا تعظیم کا متمنی ہوتا ہے۔حضرت شیخ الہندؒ اس وصف میں بھی نمایاں اور ممتاز تھے، مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

> ''حضرت شیخ الہندؒ کا طبعی مذاق تھا کہ وہ غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے اور اپنی عادت، لباس، چال، معاملات وغیرہ اس قسم کا رکھنا چاہتے تھے۔اہل دنیا اور امرا اور تکلف والوں سے گھبراتے تھے ..... ریل میں تیسرے درجے میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے''۔[۲۵]

وہ بداہتہً خود کو ہر کمال اور عظمت سے معرا باور کرتے تھے۔مولانا قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں:

> ''اس رفعت شان پر بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا نفس کا کوئی تقاضا باقی ہی نہیں رہا تھا۔ یا اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی، یا اسے پامال کرنے کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی''۔[۲۶]

اس سلسلے میں شیخ الہندؒ کی زندگی کے تین واقعات ملاحظہ کیجیے۔یہ عاجزی وفروتنی آج بھی عوام سے زیادہ

خواص سے اتباع وتقلید کا مطالبہ کررہی ہے۔قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں اکثر مساجد میں کسیر بچھادی جاتی تھی جو نرم بھی ہوتی تھی اور گرم بھی، یہ گھاس تالابوں میں پیدا ہوتی ہے، جب سوکھ جاتی ہے تو لوگ اسے بچھانے کے لیے لے آتے تھے، اسے دیہات کا قالین یا نرم گدہ سمجھنا چاہیے۔حضرت شیخ الہندؒ کی مسجد میں بھی سردیوں میں برابر اس کا فرش ہوتا تھا، موسم سرما آنے پر ایک دن خود ہی طلبہ سے فرمایا کہ آؤ بھئی مسجد کے لیے کسیر لے آویں، چار طلبا کے ساتھ ہولیے، انھیں حضرت اپنے باغ میں لے گئے، وسطِ باغ میں تالاب بھی تھا اور اس پر کسیر بہ کثرت پیدا ہوتی تھی، چناں چہ کسیر کاٹی گئی، خود حضرت بھی ورانتی سے کاٹنے میں شریک رہے، کاٹ کر جمع شدہ ذخیرے کے پانچ گٹھر بنائے، طلبا نے عرض کیا کہ حضرت پانچ گٹھریاں کیوں بنائی گئی ہیں ہم تو چار ہیں، فرمایا اور میرا حصہ کہاں گیا؟ یہ کہہ کر چار بڑی بڑی گٹھریاں تو طلبا کے سروں پر رکھوائیں اور ایک اپنے سر پر رکھی، ہر چند طلبا بہ ضد ہوئے کہ حضرت اس ذخیرے کی چار گٹھریاں کردی جائیں ہم کافی ہیں، کچھ زیادہ بوجھ نہیں، مگر حضرت نے نہ مانا، چار گٹھریاں طلبا کے سروں پر اور ایک اپنے سر پر رکھ کر یہ قافلہ چلا۔شہر میں آیا اور بازار کے ایک حصے میں سے گذرا، ان طلبا کو تو ممکن ہے کہ سر پر گھاس رکھ کر بازار میں سے گذرنے پر کچھ عار آرہا ہو لیکن حضرت کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا اپنے کو اس بوجھ اٹھانے کا اہل اور مستحق سمجھ کر شہر سے گذر رہے تھے، دیہات والے بھی اب جسے پسند نہیں کرتے موصوف کے یہاں وہ بوجھ ایک معمولی بات تھی''۔[۲۷]

قاری محمد طیبؒ اسی واقعے سے متصل ایک اور واقعہ بھی نقل کرتے ہیں جس میں تواضع، خاکساری، للّٰہیت، شفقت، محبت اور حسن اداسب ہی اسباق موجود ہیں، قاری صاحب لکھتے ہیں:

''میرے خسر مولوی محمود صاحب رام پوری فرماتے تھے کہ وہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں چھوٹی مسجد میں رہا کرتے تھے، جس میں حضرت مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا قیام تھا، اس زمانے میں طلبا میں چارپائی کا دستور نہ تھا، سادگی اور تواضع سے عموماً طلبہ زمین پر لیٹتے تھے۔مولوی صاحب باوجود رئیس گھرانے کا ایک فرد ہونے کے عام طلبا کی طرح فرش زمین پر ہی اپنے حجرے میں لیٹا کرتے تھے۔حضرت شیخ الہندؒ کا موصوف سے اور رام پور کے اس گھرانے سے بہت گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا اور مولوی محمود صاحب مرحوم سے یوں بھی خصوصیت زیادہ تھی، ایک دن حضرت شیخ الہندؒ چھوٹی

مسجد میں تشریف لائے اور مولوی محمود صاحب کے حجرے پر گذر ہوا، یہ زمین پر فرش بچھائے لیٹے تھے، فرمایا محمود! تیرے پاس چارپائی نہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت چارپائی تو نہیں ہے، مجھے زمین پر لیٹنے کی عادت ہوگئی ہے، اس سے بہت متاثر ہوئے مگر فرمایا کچھ نہیں، اگلے دن دوپہر کا وقت تھا گرمی شدید تھی، لو چل رہی تھی کہ مولوی صاحب نے کھڑکی سے دیکھا، حضرت اپنے کندھے پر ایک چارپائی لیے خود تشریف لا رہے ہیں، وزنی چارپائی ہے مگر اسے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب صورت حال دیکھتے ہی حجرے سے نکل ننگے سر اور ننگے پیر حضرت کی طرف دوڑے، حضرت انھیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہیں سڑک پر کھڑے ہوگئے اور چارپائی زمین پر رکھ دی، جب قریب پہنچے تو ایک خاص انداز سے فرمایا جناب یہ لے جاؤ اپنی چارپائی مجھ سے نہیں اٹھتی، میں بھی شیخ زادہ ہوں مجھ سے یہ چارپائیاں نہیں گھسیٹی جاتیں۔ یہ فرما کر پیٹھ پھیر لی اور گھر روانہ ہوگئے، مولوی صاحب کچھ کہنے ہی نہ پائے اور چارپائی اٹھا کر حجرے میں لے آئے، گویا انھیں کوئی کلمۂ معذرت بھی نہیں کہنے دیا کہ وہ معنی ثناءِ حسن ہوجاتی''۔ [۲۸]

شیخ الہندؒ: بہ یک وقت اپنے معمول کی پابندی اور طلبا کی رعایت:

قاری محمد طیب صاحب ہی نقل کرتے ہیں کہ:

''حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو حضرت گنگوہیؒ کے پاس حاضری کے لیے گنگوہ کا سفر پیدل کرتے تھے، جمعرات کو چھٹی کا گھنٹہ بجتا، اسی وقت سبق سے اٹھ کر گنگوہ کا راستہ لیتے، گنگوہ دیوبند سے ۲۲ کوس یعنی ۳۰ میل ہے، حضرت اذان عصر پر چلتے اور عشا گنگوہ پڑھ لیتے تھے۔ جمعے کا پورا دن حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گزار کر اذان عصر کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے اور عشا دیوبند میں پڑھ لیتے تھے۔ برس ہا برس یہ معمول رہا، سردی ہو یا گرمی یہ معمول قضا نہ ہوتا تھا۔

مولوی محمود صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن ہم دو تین طلبا نے اصرار کیا کہ حضرت ہم بھی ساتھ چلیں گے، فرمایا اچھا، مگر اس دن حضرت نے ان طلبا کی رعایت سے پیدل سفر کرنے کے بجائے ارادہ کیا کہ سفر سواری پر ہو، تو کمہار کا ایک ٹٹو کرایہ پر لے لیا اور ارادہ یہ کیا کہ دو تین طلبا اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، چناں چہ کمہار ٹٹو لے کر دارالعلوم کے دروازے پر آ گیا، حضرت حسبِ معمول اذانِ عصر

کے قریب درس سے اٹھے، یہ طلبا بھی حاضر تھے تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی میاں محمود پہلے تم سوار ہو پھر باری باری ہم بھی سوار ہوتے رہیں گے، انھوں نے حضرت کے سوار ہونے پر اصرار کیا تو حضرت نے نہ مانا اور زبردستی مولوی محمود صاحب کو سوار کر دیا، دو طلبا اور خود حضرت پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہوئے بلکہ ایک قمچی لے کر ٹٹو کو ہنکانا بھی اپنے ذمے لے لیا۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں سخت ضیق میں تھا کہ حضرت تو پیچھے پیچھے پیدل ہیں اور میں سوار ہوں مگر مجبور تھا حکم یہی تھا، دو چار میل چل کر یہ ٹٹو سے اتر گئے تو حضرت نے زبردستی دوسرے طالب علم کو بٹھا دیا اور خود ٹٹو ہانکتے جا رہے ہیں، چار پانچ میل کے بعد دوسرے طالب علم کو چڑھا دیا۔ غرض تیس میل کا سفر پورا طے ہو گیا مگر خود نہیں چڑھے باری باری ان طلبا کو بٹھاتے رہے، اس وقت معلوم ہوا کہ یہ ٹٹو اپنے لیے کرائے پر نہیں لیا تھا بلکہ ان طلبہ کے لیے شفقتاً لیا گیا تھا۔ جمعے کو واپسی ہوئی تو طلبہ گھبرائے کہ اب پھر وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ٹٹو پر سوار ہوں گے اور حضرت پیدل چلیں گے، باہم مشورہ ہوا کہ آخر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم پیدل چلیں اور حضرت کو ٹٹو پر سوار کر دیں۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں نے کہا ترکیب تو میں کر دوں گا کہ حضرت پورے راستے ٹٹو سے نہ اتر سکیں مگر ایک دفعہ سوار کر دینا ہے۔ چناں چہ جب گنگوہ سے روانگی ہوئی تو حسبِ معمول طلبا پر زور دیا کہ سوار ہو مگر یہ لوگ ایکا کر چکے تھے عرض کیا کہ حضرت آتے ہوئے ہم سوار رہے اب واپسی میں یہ نہیں ہوگا، حضرت سوار ہوں خواہ پھر اتر لیں مگر ابتدا حضرت ہی کے سوار ہونے سے ہوگی۔

جب یہ سب اکٹھے ہو کر بہ ضد ہوئے تو آخر حضرت نے قبول فرما لیا اور ٹٹو پر سوار ہو گئے۔ طلبا نے چپکے سے مولوی محمود سے کہا کہ تم اب وہ موعودہ ترکیب کرو کہ حضرت دیوبند تک ٹٹو سے نہ اترنے پائیں، چناں چہ مولوی صاحب نے وہ مؤثر نسخہ استعمال کیا کہ جب حضرت سوار ہو گئے تو انھوں نے ٹٹو کے برابر میں آ کر حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ، حضرت حافظ شہیدؒ وغیرہ اکابر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حضرت کی عادت تھی کہ ان بزرگوں کا ذکر چھڑتے ہی ان میں محو ہو جاتے تھے اور پھر ادھر اُدھر کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔

ان حضرات کا ذکر چھڑتے ہی جو حضرت نے ان بزرگوں کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو حضرت کو نہ راستے کی خبر رہی نہ ان طلبا کی، پورے تیس میل کا سفر طے ہو گیا، ندی آ گئی جو دیوبند سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ندی دیکھتے ہی حضرت نے گھبرا کر فرمایا کہ اوہو! ندی آ گئی اور یہ کہہ کر

ٹٹو سے کود کر اترے۔ فرمایا بھائی میں نے تم سب کا حق مار لیا لو جلدی سے تم سوار ہو، طلبہ نے ہر چند حضرت کے بیٹھنے کا اصرار کیا مگر حضرت تہیہ فرما چکے تھے کسی کی نہیں سنی، باری باری ان لوگوں کو بٹھلایا، شہر میں داخل ہوئے تو پھر اسی شان سے کہ طلبا سوار ہیں اور حضرت پیدل ہیں، چھتی ہاتھ میں ہے اور ٹٹو ہانک رہے ہیں جس سے طلبا بچنا چاہتے تھے بالآخر وہی چیز پھر سامنے آکر رہی۔ سبحان اللہ بے نفسی اور شفقت کی انتہا ہے۔ [۲۹]

شیخ الہندؒ: اتباع شیخ کا مثالی نمونہ:

اس مقام پر اگر چہ یہ واقعہ شیخ الہندؒ کے معمول کی پابندی اور طلبا کے حق میں شفقت و رعایت کی غرض سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر اس سے متصل ایک اور اہم واقعہ بیان نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی اور منازل سلوک و احسان میں شیخ کی اتباع کامل کے متعلق شیخ الہندؒ کا اسوہ پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آسکے گا۔ شیخ الہندؒ کا یہ معمول ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ کا جمعرات کے روز چھ گھنٹے پڑھانے کے بعد دیوبند سے گنگوہ پیدل جانے کا معمول تھا۔ ایک دفعہ:

''شیخ الہندؒ کے دوست نے جو زمانہ طالب علمی سے دوست تھے اور بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی، پوچھا کہ او محمود! بتا تو دے، گنگوہ میں کیا رکھا ہے جو تو ہر جمعرات کو دوڑا دوڑا جاتا ہے؟ شیخ الہندؒ نے جواب دیا: ظالم تو نے پی ہی نہیں! اب کے تو بھی چل! ـــــ وہ ساتھ جانے پر تیار ہو گیا، چناں چہ ساتھ لے گئے، اتفاق سے ان دنوں شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مزار پر عرس ہو رہا تھا۔ حضرت امام ربانی [گنگوہیؒ] کا معمول عرس کے ایام میں ابتدا تو یہ تھا کہ ان دنوں میں گنگوہ چھوڑ دیتے تھے، خانقاہ خالی کر دیا کرتے تھے اور جب معذور ہو گئے تھے تو سفر ترک فرما دیا تھا۔ ہاں! خانقاہ میں نہیں آتے تھے، البتہ نماز کے لیے پانچوں وقت تشریف لاتے، بلکہ نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ اتنا لحاظ عرس والے بھی کرتے تھے کہ اذان کے وقت سے جماعت ختم ہو جانے اور سنتیں وغیرہ پڑھنے تک قوالی بند کر دیا کرتے تھے۔ ان ایام میں حضرت کے یہاں مہمانوں کی آمد و رفت بالکل بند رہتی تھی، کسی سے مصافحہ تک نہیں کرتے تھے ـــــ غرض حضرت شیخ الہندؒ رات کے وقت گنگوہ پہنچے اور حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے۔ حضرت نے دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا اور فرمایا، ابھی واپس جاؤ۔ آپ [شیخ الہندؒ] کے ایک اور بھائی اور دوست تھے شاہ مظہر حسین گنگوہیؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ محشی ابوداؤد کے بھائی،

انھوں نے عرض کیا، حضرت! یہ عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، آپ کے پاس آئے ہیں۔ حضرت [گنگوہیؒ] نے ارشاد فرمایا، میں بھی جانتا ہوں عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، میں اتنا بھولا نہیں ہوں۔ میرے پاس آئے ہیں، مگر آئے تو ہیں اس مجمعے میں ہوکر، ان کے ذریعے اس مجمعے کی رونق تو بڑھی، من کثر سواد قوم فھو منھم [جس نے کسی قوم کے افراد میں اضافہ کیا وہ ان ہی میں سے ہے] وارد ہوا ہے، قیامت کو اپنی برأت کرتے رہیں۔ اس کے بعد شاہ مظہر حسن گنگوہیؒ ان [شیخ الہندؒ] کو اپنے مکان پر لے گئے اور کہا روٹی تو کھالو، اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے آب دیدہ ہوکر فرمایا کہ ''حضرت تو فرمادیں ابھی چلا جا، میں کس منھ سے کھاؤں!'' چناں چہ اسی وقت گنگوہ سے واپس ہوگئے پھر دوسرے وقت عرس ختم ہونے کے بعد حاضر ہوئے''۔ [۳۰]

شیخ الہندؒ: استاذ نانوتوی کی خدمت: ۲۲ میل کا پیدل سفر:

جس انسان کا نفس اس درجے مزکی اور مطہر ہو چکا ہو، اس کا قلب اپنے محسنین اور اساتذہ، جن سے اسے علم وفضل اور صلاح وتقوے بلکہ ایمان میں رسوخ اور عمل میں دوام کی دولت میسر آئی ہو، کی محبت سے کس درجے لبریز ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ محبت ہی انسان کو محبوب کا خادم اور محبوب کو مخدوم بناتی ہے۔ اس خدمت کا صرف ایک نمونہ دیکھیے، ایک مرتبہ مولانا نانوتویؒ کو بخار تھا۔ زمانہ برسات کا تھا اور آنا دیوبند تھا۔ شیخ الہندؒ نے استاذ نانوتویؒ کو گھوڑے پر سوار کیا، ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہوکر حضرت کی کمر کو سہارا دیا اور اس طرح ۲۲ میل کا راستہ پیدل طے کیا۔ [۳۱]

۲۲ میل کا پیدل سفر ـــــــ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کو استاذ کی محبت نے بے خود کردیا ہو۔

شیخ الہندؒ: مولانا نانوتویؒ کے والد کی اولاد سے بڑھ کر خدمت:

چلیے حضرت نانوتویؒ تو استاذ تھے، اس طرز کی خدمت کی مثالیں ڈھونڈنے سے دیگر باصفا حضرات کے یہاں بھی مل جائیں گی۔ لیکن ایک واقعہ اس سے زیادہ حیران کردینے والا ہے جو استاذ نانوتویؒ سے نہیں بلکہ ان کے والد محترم سے متعلق ہے۔ مولانا قاری طیبؒ لکھتے ہیں:

''حضرت نانوتوی کے والد شیخ اسد علی مرحوم جب مرض وفات میں شدید مبتلا ہوئے تو علاج کے لیے دیوبند لائے گئے، قیام شیخ الہند کے مکان پر ہوا، دستوں کا مرض تھا..... ایک دفعہ دست چارپائی پر خطا

ہوگیا اس وقت حضرت نانوتوی بھی یہاں موجود نہ تھے، حضرت شیخ الہند موجود تھے اور صورت ایسی ہوگئی کہ نجاست اٹھانے کے لیے ظرف بھی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کردی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت نانوتوی پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہند کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں۔ اس پر حضرت نانوتوی بہت متاثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوندا! محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لیے مانگ سکتے تھے ہاتھ اٹھائے ہوئے مانگتے رہے''۔ [۳۲]

مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کی اولادوں سے خادمانہ برتاؤ کے مظاہر:

اس خدمت ومحبت اور مولانا نانوتویؒ کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں نے شیخ الہندؒ کی عظمت ورفعت کو ثریا تک پہنچادیا ـــــــ مولانا نانوتویؒ کے خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے ذہین وذکی تلامذہ ہوں گے، لیکن آج ان کی اکثریت کا نام تاریخ اور ماضی کے دھندلکوں کی نظر ہو چکا اور شیخ الہندؒ کا نام مولانا نانوتویؒ کے ساتھ ایسے جڑا ہوا ہے جیسے رومیؒ کا شمس تبریز کے ساتھ ـــــ یہ استاذ کی محبت ہی کا اثر ہے کہ مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے متعلقین سے شیخ الہندؒ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے ـــــــ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ، جو شیخ الہند کے شاگرد تھے، کے متعلق شیخ الہندؒ نے فرمایا:

''حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانے کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا''۔ [۳۳]

شیخ الہندؒ، حافظ صاحب کے استاذ ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے مؤدب اور نیاز مندانہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی کہ جب حافظ صاحب شیخ الہندؒ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور شیخ الہند صحن مکان میں چارپائی پر بیٹھے ہوتے، دروازے کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں حافظ صاحب آتے ہوئے شیخ الہند کو نظر پڑ جاتے تو حضرت چارپائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کہ حافظ مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اور ان کے بٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے، اسے اپنے سرہانے بچھاتے، جب حضرت حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چارپائی پر بیٹھ جاتے۔ [۳۴]

یہ تو بہ راہِ راست مولانا نانوتوی کی اولاد کا معاملہ تھا، اب مولانا نانوتویؒ کی تیسری نسل یعنی حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادگان مولانا قاری محمد طیب اور مولانا محمد طاہر کے ساتھ رویہ دیکھیے۔ قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں، جب شیخ الہندؒ نے مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند ورود فرمایا تو حافظ صاحب نے فرمایا کہ حضرت ان دونوں بچوں [محمد طیب اور محمد طاہر] کو بیعت فرمالیجیے تو از راہ تفنن فرمایا:

''لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے۔ دو بزرگوں [حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ] کے دو ہی صاحبزادے ہیں [مولانا مسعود احمد گنگوہیؒ اور حافظ احمد صاحبؒ] اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے، اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کرلیا تو کہیں گے کہ دیکھو اس نے آگے کو بھی قبضہ رکھنے کو داغ بیل ڈال دی ہے ـــــ دو دن کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم تشریف لاکر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے۔ میں نے عرض کیا حضرت کیوں یاد فرمایا؟ فرمایا مرید کرنا ہے۔ اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لیے ہمیں خود حاضر ہونا تھا، لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے''۔ [۳۵]

استاذ کی اولاد کی اولاد کے حق اور خدمت کا ایک اور محیر العقول واقعہ دیکھیے جو اپنے تأثر میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب قاری طیب صاحب کا رشتہ شیخ الہند کے ایما و حکم پر رام پور کے ایک باعزت و دین دار گھرانے میں طے ہوا تو شیخ الہندؒ نے بڑی امنگ اور جوش مسرت سے فرمایا کہ بھائی! یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا۔ چناں چہ یہ پیغام خود ہی لے کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں جا کر فرمایا:

''میں اس وقت حضرت نانوتویؒ کے گھرانے کے ایک ڈوم اور حجام کی حیثیت سے رشتے کا پیامی بن کر آیا ہوں''۔ [۳۶]

حواشی

(۲۵) حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۹۔.....(۲۶) قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام [مرتب: محمد عمران قاسمی بگیانوی]، مردان: مکتبۃ الاحرار، ۲۰۱۱ء، جلد ۷، صفحہ ۴۲۲۔.....(۲۷) ایضاً، صفحات ۴۲۲-۴۲۳۔.....(۲۸) ایضاً، صفحہ ۴۲۳۔.....(۲۹) ایضاً، صفحہ ۴۲۴-۴۲۵۔.....(۳۰) محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد ۱، صفحات ۱۰۶-۱۰۷، قسط اوّل۔.....(۳۱) عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرہ مشائخ دیوبند، بجنور: زرین کتب خانہ، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۲۰۲۔.....(۳۲) قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد ۷، صفحات ۴۲۶-۴۲۷۔.....(۳۵)۔ ایضاً، صفحہ ۴۲۱-۴۲۲۔.....(۳۶) ایضاً، صفحہ ۴۲۶۔(۳۳)۔ ایضاً، صفحہ ۴۳۹۔..... (۳۴) ایضاً، صفحہ ۴۳۹-۴۴۰۔